سرچشمۂ عرفان حضرت علیؑ
وسط ایشیا کے مآخذ کی روشنی میں

پروفیسر منصورہ حیدر

دنیای اسلام میں حضرت علیؑ کی عظیم شخصیت اور ان کے کردار کے مختلف پہلوؤں نے نہ صرف اہل اسلام بلکہ سیاسی مفکروں، صوفیوں دانشمندوں، فلسفیوں، اہل علم و ادب، فنکاروں، فقرا و گدا، شاہوں اور فلاح و بہبود کے کاموں میں وقف لوگوں کے طرز زندگی کو ایک نیا رخ و لائحہ عمل بخشا ہے۔ وہ کئی اعتبار سے یکتائے زمانہ اور گوہر نایاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بہترے دیگر افراد کی طرح حضرت علیؑ کا نام محض مذہبی کتابوں میں سمٹ کر نہیں رہ گیا بلکہ ان کی غیر معمولی سوجھ بوجھ اور تاریخی اہمیت کی وجہ سے ان کا ذکر عہد وسطیٰ کے سبھی مخطوطات، ملفوظات، تذکروں، تاریخ عامہ، عقیدوں، خطاطی کی کتابوں، صوفیانہ شاعری، علوم ظاہری و باطنی کے دفاتر میں مختلف زاویوں سے ابھرتا اور نکھرتا دکھائی دیتا ہے۔ حضرت علیؑ کی حیات اور ان کی عظیم تحصیلات سے متعلق معلومات کا جو ذخیرہ عربی و فارسی کی کتابوں میں ملتا ہے اس پر نہایت خوبی سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ وسط ایشیا کے عہد وسطیٰ میں لکھی گئی کتابوں میں حضرت علیؑ کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے ممکن ہے کہ لوگوں کی نظر سے کم گزرا ہو۔ اس مقالہ میں حضرت علیؑ کی شخصیت اور کارناموں کی تفصیل وسط ایشیا کے ماخذ کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

وسط ایشیا اور ایران کے تقریباً سبھی مخطوطات میں حضرت علیؑ کو انسان کامل کے پیکر میں دکھاتے ہوئے جن القاب و خطابات سے نوازا گیا ہے وہ ان کے سلسلے میں اہل فکر و اہل قلم و ادب کے جذبات مظاہرہ اور محبت کی غمازی کرتا ہے اور حضرت علیؑ کے سلسلے میں ان کے اعتقاد کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ ان کے ہم عصر اور بعد کے مورخین میں حضرت علیؑ کے متعلق سیاسی اور مذہبی نظریوں میں اختلاف رائے ممکن ہے مگر ان کے کارناموں، ان کی غیر معمولی ذہانت و عظمت، جولانیٔ فکر،

خیالات کی ہم آہنگی، علم و ادب پر ان کے عبور، خدا پرستی، دور اندیشی اور دنیاوی و دینوی معاملات میں ان کی لیاقت پر کسی کو بھی شبہ نہیں۔ حضرت علیؑ کو وجہ مقتدا رسول، پیشوای شان نبیؐ و الٰہی حضرت رسالت کہا گیا ہے۔ حضرت علیؑ کے خطابات کاتب وحی، وزیر، مرتضیٰ اور امیرالمومنین کے علاوہ انہیں بیحد موزوں القاب مختلف اسلامی اعتقادات کے حامل لوگوں نے دیئے ہیں۔ اس ضمن میں نہ صرف صوفی ملفوظات بلکہ تاریخی ملفوظات یکساں جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کتابوں میں حضرت علی کو امام المتقین، امام المستقیم، اسداللہ الغالب، مظہرالعجائب و الغرائب، امام المسلمین وغیرہ کہا گیا ہے۔ رسالۂ مبلغ الرجال میں انہیں خدائے عظیم کا پرستار اور راستی کا عمل گذار اور دونوں کا معتقد بتایا ہے۔ زین الدین محمود واصفی نے بدائع الواقایع میں انہیں 'یعسوب المؤمنین' کہا ہے۔ حکیم خاں نے اپنی کتاب منتخب التواریخ میں خلفاء راشدین پر جو تذکرہ لکھا ہے اس میں حضرت علیؑ کی بیحد تعریف لکھی ہے۔

منہاج السراج الجرجانی نے طبقات ناصری میں علی مرتضیٰ کی پاک و صاف شخصیت پر نذرانے پیش کیے ہیں۔ حضرت علیؑ کے لئے منقبت اور قصیدوں کا ذخیرہ تیموری عہد کے تقریباً سبھی مخطوطات میں موجود ہے۔ حضرت علی اپنے افعال و اقوال، اخلاق و آداب میں پاک و راشد تھے وہ معتدل مزاج، خوش اخلاق، باوصف، صائب رائے، باہمت، بہادر، جنگجو، شاکر و صابر، دوستوں کے لئے معاون و پناہ گاہ رہبر و سہارا اور دشمنوں کے لئے بے نیاز اور بے اعتنا۔ نہ شماتت کی جھلک، نہ کامیابی کے موقع پر غرور کا شائبہ۔ ایک طرح سے وہ عربوں کے افسانے کے سلیمان تھے جن کے چہار طرف ان کی شاندار شاعری 'ضرب المثل' خطبات اور ان کی مختلف سرگرمیوں کی چمک کا ہالہ تھا۔ ایک ہی وقت میں وہ مسلمانوں کے امیر اور فتویٰ کے رہنما دونوں تھے اور اس دوہری حیثیت کے متضاد پہلو بھی ان کی شخصیت میں کچھ اس طرح گھل مل گئے تھے کہ وہ صوفی کے فقر اور شاہوں کی غنا سے مستثنیٰ تھے۔ حضرت علیؑ کی تعریف سبھی عرفاء اور درویش برادری نے کی ہے۔ انہیں گناہوں سے مبرا و بالاتر اور معصوم بتایا ہے۔ غلاہ والوں نے انہیں 'اوتار' بتایا ہے اور حضرت علیؑ اور ان کے اخلاف کو 'انسانی لباس میں خدا کا پرتو' سمجھا۔

حضرت علیؑ کی ذات پاک کچھ غیر معمولی خصوصیات کی حامل تھی اس میں کلام نہیں۔ پیدائش سے

وفات تک کچھ ایسا امتیاز ان کے ساتھ رہا ہے جو صرف خصوصی خداداد نعمت و صلاحیت کے علاوہ کچھ نہیں ہوسکتا ہے۔ ان کی پیدائش کعبہ میں ہوئی یہ وہ شان وعزت تھی جو ان سے پہلے اور ان کے بعد کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ انہیں رسول اللہ کی دامادی کا فخر حاصل تھا خصوصاً اس لئے کہ حضرت فاطمہ ان کی عزیز و پارہ جگر دختر تھیں۔ پیغمبر خدا کی نسل چلانے کا عروج بھی حضرت علیؑ کے دامن میں آیا تھا۔ وہ حضرت خدیجہ کے بعد دوسرے ایمان لانے والے کہے گئے ہیں۔ حضرت علیؑ کی پرورش اور ان کی نشوونما براہ راست رسول اللہ کے زیر سایہ ہوئی اور ۲۳ سال تک حضرت علیؑ کو ہی یہ سعادت نصیب تھی کہ وہ سائے کی طرح رسول اور ان کی ذریات کے ساتھ درد و دکھ، کامرانی و ناکامی سبھی کیفیات میں ہم قدم رہے۔ پیغمبرؐ کی نگہداشت نے ان کے جوہر چمکائے اور وہ نہ صرف حضرت محمدؐ کے پیرو بلکہ قدم بقدم شانہ بشانہ ان کے ہمکار بھی رہے ۔ ملا حسین واعظ کاشفی لکھتے ہیں:" امیر المومنین کہ سرعارفان اسرار الوصیت وسرور کاشفان استار ربوبیت است، آثار انفاس پیغامبر اکرم بودہ است"۔

مورخین کا خیال ہے کہ خلیفہ سوم کے انتقال کے فوراً بعد اسی دن سبھی صحابہ کرام و دیگر افراد نے حضرت علیؑ کے دست مبارک پر بیعت کرلی تھی۔ شہرستانی لکھتا ہے کہ اہل نص والتعین تو اس حد تک گئے کہ انہوں نے شدومد اور سختی سے صرف حضرت علیؑ کے حقیقی وارث ہونے پر زور دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی دنیا کے کونے کونے میں حضرت علیؑ کے خلیفہ ہونے پر ۲۴ جون ۶۵۶ میں خوشحالی کی لہر دوڑ گئی۔ گوکہ وسط ایشیا خود بہادروں اور جنگجولوگوں کی آماجگاہ رہا ہے اور عربوں کی حرب آزمائی میں بھی کہیں کمی نہ تھی، اس کے باوجود حضرت علیؑ کی غیر معمولی شان جلادت و تیغ آزمائی کے افسانے دہرائے جاتے رہے۔ حضرت علیؑ کی تلوار 'ذوالفقار' حضرت محمدؐ نے جنگ بدر میں استعمال بھی کی تھی۔ عہد وسطیٰ کی سبھی تلواروں پر "لافتیٰ الاّ علی لاسیف الاّ ذوالفقار" کندہ ہونا اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ کوئی تلوار علیؑ کی ذوالفقار کے برابر نہیں اور کوئی جانباز و بہادر نوجوان حضرت علیؑ کا ہمسر نہیں۔ مگر حضرت علیؑ صرف اہل سیف ہی نہیں اہل قلم بھی تھے۔ ان کی کتاب نہج البلاغہ اس کا ثبوت ہے اور وہ فن بیان و بلاغت میں ماہر تھے۔ ان کے احکام، تقاریر، خیالات اور اخلاقی قدریں صدیوں سے مشعل راہ اور ان کے جملے تجربہ کاری و دوراندیشی پر محمول، خدا پرستی کے جذبوں سے معمور رہے۔ شاعرانہ انداز میں ان کی لن ترانی بھی زندگی کے تلخ تجربوں اور حقائق کا نچوڑ ہے جو عام آدمی کو

بصیرت و بصارت دونوں بخشتا ہے اور روشنی کے ستارہ کی طرح بھولے بھٹکوں کو راستہ دکھا کر منزل تک پہنچاتا ہے۔ ہٹی نے اپنی تاریخ عرب میں لکھا ہے کہ ''حضرت علی کی موت کے بعد ان کی اہمیت کہیں زیادہ اجاگر ہوئی اور کھل کر سامنے آئی بہ نسبت ان کی عہد زندگی کے'' شائد اس لئے کہ حضرت علیؑ کی ساری زندگی کشمکش اور حوادث کا شکار رہی تا کہ دنیا کے لیے سبق آموز ثابت ہو۔

ایران اور وسط ایشیا کے مورخین نے کچھ ایسے واقعات کا ذکر کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ کے دشمن بھی ان کے اعلیٰ صفات کے قائل تھے جیسے محمد بن عطیہ کی اسناد پر نہ صرف وسط ایشیا کے حکیم بن ثورہ، سیف الدین اور اعظم جابر بلکہ ایرانی مورخ بناکتی اور عرب تاریخ نویس ابن عرب شاہ نے بھی لکھا ہے کہ ایک دن امیر معاویہ کے دربار میں ابن سفیان نے حضرت علیؑ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ کیا امیر معاویہ یہ بتا سکتے ہیں کہ ''حضرت علیؑ و امیر معاویہ کے درمیان کون زیادہ بہتر ہے؟'' معاویہ نے جواب دیا کہ ''حضرت علی کیونکہ ان کے اقدام و افعال زیادہ محتاط تھے اور میرے تحفظ کا باعث بنے''۔ اب مجمع کا سوال تھا ''امیر معاویہ! کیا آپ حضرت علیؑ سے زیادہ عظیم اور افضل ہیں؟' 'جواب ملا کہ ''ابن ابی طالب، ابی سفیان کے سبھی اخلاف سے بہتر ہیں''۔ اس پر بے تابانہ اور ایک ساتھ آواز اٹھی 'تو کیا سچائی اور حق علی کے ساتھ تھا۔ یا معاویہ کے ساتھ؟ معاویہ نے برملا کہا 'علی کے ساتھ' حیرت زدہ محفل پر سناٹا چھا گیا۔ مگر پھر پوچھا 'لیکن پھر آپ نے ان سے جنگ کیوں کی؟ آخر اس جنگ کی وجہ کیا تھی؟' معاویہ نے خندہ پیشانی سے حقیقت تسلیم کرنے میں عار نہ کی اور جواب دیا ''وہ لوگ جو بادشاہت کے خواہاں ہوتے ہیں وہ کسی سے سمجھوتہ کے قائل نہیں ہوتے نہ کسی کی اہمیت تسلیم کرنے پر تیار ہوتے ہیں، جو اقتدار کا جویا ہوتا ہے وہ رشتوں اور مناسبت کو مدنظر رکھ کر نہیں چل سکتا''؟۔

حضرت علی کی مقناطیسی شخصیت اور اعلیٰ صفات کا سحر انگیز اثر دیرپا ہی نہیں بلکہ صدیوں سے آج تک حیات کائنات پر چھایا ہوا ہے۔ حضرت علیؑ کے نام نامی کے دم قدم سے ہی کتنے پرچم دنیا میں لہرائے گئے اور کتنی تحریکیں دنیا میں مختلف کونوں اور زمانوں میں شروع ہوئیں ان سے حضرت علیؑ کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ۸۶۹ میں بغاوت کے دوران گندھک کی کھانوں میں کام کرنے والے زنگی، حبشی غلام مشرقی افریقہ میں ایک عرب علی ابن محمد کے خود کو علی کا اخلاف و وارث بتانے پر

اسے اپنا 'نیا مسیحا' سمجھ کر اس کے ارد گرد طواف کرنے لگے تھے۔ علی ابن محمد کے اس غلط دعویٰ اور نجات کا راستہ دکھانے کے وعدوں کی وجہ سے ان غلاموں کے سبھی طبقے ایک ایک کر کے اس کے علمبرداروں میں شامل ہو گئے۔ وسط ایشیا میں خوارزم شاہ نے ۶ صدیوں بعد علی کے حق اور سچ پر ہونے کی اہمیت پر زور دیا اور عباسی خلیفہ عبدالناصر کو غاصب بتاتے ہوئے اس کی جگہ براہ راست حضرت علیؑ کے وارث کو جانشین مقرر کرنا چاہا تھا۔

سلطان حسین بایقرا جو تیمور کا ہی ایک وارث تھا شیعہ مذہب اور علی کا دلدادہ تھا۔ یہ بات مختلف تاریخی ذرائع سے ثابت بھی ہوتی ہے۔ مشہور ہے کہ ۸۸۵ میں خواجہ خیران قریہ میں ایک دفعہ بایقرا سلطان نے ایک قبر دیکھی تھی جسے لوگوں نے کھودا تھا۔ اس خبر پر کہ شائد یہ قبر حضرت علیؑ کی ہو سلطان حسین دوڑتا ہوا وہاں پہنچا تھا اور فوراً یہ حکم دیا تھا کہ وہاں ملا بنائی نامی شخص کو جو اس وقت کا مشہور ملا، مورخ اور شاعر تھا بلایا جائے۔ ملا بنائی کو حکم دیا گیا کہ وہاں شاندار مقبرہ بنایا جائے جسے ایوان، بازار، دوکانوں حجروں اور گھروں سے سجا دیا جائے تا کہ وہاں ایک نیا مقبرہ سا بن جائے۔ بلخ کی ایک نہر شاہی اس جگہ کے لئے وقف میں دیدی گئی۔ سید تاج الدین اندخودی کو جو میر برکہ کا ایک اخلاف تھا، وہاں کا نقیب اور شیخ زادہ بسطامی کو وہاں کا شیخ مقرر کیا گیا۔ اس روضہ کی حفاظت و نظام و تنظیم کے لئے کئی اور اوقاف بھی مقرر کئے جس کے کچھ اصول اور قانون بنائے گئے تا کہ قاعدہ سے اسے چلایا جا سکے اور طلباء کے وظیفے، نوکروں کی تنخواہیں اور مزید اخراجات و نذرانوں کا بھی انتظام مکمل و بخوبی طور پر کیا جا سکے۔ فخرالدین علی بن حسین الواعظ الکاشفی نے جو جامی کے قریبی رشتہ دار بھی تھے اور جامی کے ہمعصر بھی (۱۵۰۶-۱۴۶۹) اپنی کتاب روضۃ الشہدا حضرت علیؑ اور ان کے جانشینوں کی شہادت پر لکھی ہے گو کہ وہ خود ایک پکے حنفی، سنی مسلمان تھے اور نقشبندی سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی کتاب رشحات عین الحیوۃ اسی سلسلہ کے بزرگ صوفیوں کے حالات زندگی اور ان کی تعلیمات پر مبنی ہے جسے خواجہ عبداللہ احرار۔ میر علی شیر نوائی جو پنجتن پاک کا عاشق بھی تھا اور پندرھویں صدی کا مشہور و معروف شاعر بھی اور جسے اوزبکوں نے آج بھی اپنا قومی شاعر ہونے کا شرف بخش رکھا ہے 'محمدؐ اور علیؑ' کا مداح اور گرویدہ تھا جس کا دل اور دماغ دونوں پیغمبر اکرم محمدؐ اور حضرت علیؑ کے لئے قربان تھے اور ان کے کام کے لئے وقف۔ علی شیر نوائی کا اعتقاد علی پر اتنا گہرا

اور زبردست تھا کہ انہوں نے مولانا حسین واعظ کا حال زندگی اسی سے متاثر ہوکر لکھا ہے اور یہ بھی کہ مولانا کے یہ الفاظ کہ حضرت 'علی کا عقیدہ اور مذہب تقلیدی تھا' ان کی موت کا باعث بنے۔

ویسے تو متعدد صوفی شعرا نے جوش و خروش سے علیؑ اور ان کے ورثاء کے لئے 'مناجات' منقبت اور قصیدے لکھے ہیں مگر یہ بھی دلچسپ بات ہے کہ اپنے سرپرست و مہربان شاعری کے دلدادہ شہنشاہوں کے لئے جو قصیدے لکھے گئے ہیں ان میں بھی وہ حضرت علیؑ کا نام جوڑنے سے نہیں چوکے۔ اس زمرۂ عقیدتمنداں میں ابوسعید حسن بن ابی الحسن لیساول بصری، فردوسی کا شاہنامہ اور شکایت نامہ اور ہجو بھی حضرت علیؑ کے عشق میں شرابور لگتے ہیں۔ فردوسی لکھتا ہے کہ وہ پیغمبر کا بندہ اور علی کا غلام ہے اور اس کی یہ بندگی اور نیازمندی رستاخیز کے وقت تک قائم رہے گی۔ اگر محمود غزنوی جیسا عظیم بادشاہ بھی اس کا قلع قمع کردے اور فردوسی کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے ڈال دے تو وہ دوبارہ اٹھے گا کیونکہ بادشاہ جانتا ہے کہ فردوسی حضرت علیؑ کے در کی خاک ہے۔

'چناں داں کہ خاک در حیدرم'

حافظ شیرازی کا قصیدہ بھی خط ناخن سے ابھرے ہوئے حرفوں میں نستعلیق میں لکھا ہوا ہے اور ابھی بھی مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے۔ جلال الدین رومی، وطراز میزدی کے قصیدے بھی مشہور ہیں۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؑ کے لئے پیغمبر محمدؐ نے یہ کہا تھا کہ میں مدینۃ العلم ہوں اور علی اس کا دروازہ حضرت علیؑ کو گرامر، تاریخ اور علم حساب پر بھی عبور تھا۔ انہوں نے عربی گرامر کی سائنس پر اور اس کی پیچیدگی پر ایک کتاب بھی تیار کرائی تھی۔ قرآن کی قرأت حلاوت بھی علیؑ کے زمانے سے شروع ہوئی۔ حضرت علیؑ کا کہنا تھا کہ علم دو طرح کا ہوتا ہے ایک مسموع جس کی تحصیل سن کر یا پڑھ کر حاصل کرنی ہوتی ہے۔ دوسرا مطبوع جو خداداد ہوتا ہے۔ مسموع علم بیکار ہوتا ہے بغیر مطبوع علم کے۔ اسی طرح جیسے نابینا کے لئے سورج کی روشنی۔

حضرت علیؑ پہلے شخص ہیں جو دنیائے اسلام میں فلسفہ الٰہی کی طرف متوجہ ہوئے اور براہ راست اس سے انہیں منطق اور دماغی قوتوں کو یکجا کرنے کا موقعہ ملا اور ایسے دقیق نکات انہوں نے نکالے جو ابھی تک کسی کی سمجھ میں نہ آئے تھے۔ ان کے شاگردوں میں اویس القرنی، کامل النحل، رشید الحیات، میسم التمر وغیرہ تھے۔ جنہیں بعد کے صوفیوں نے اسلام میں علم معرفت (gnosis) کا بانی کہا

ہے۔ جب حضرت علیؑ سے علم معرفت (gnosis) کی تعریف پوچھی گئی تو انہوں نے صرف یہ کہا کہ میں نے خدا کو جانا خدا کے ذریعہ اور وہ جو خدا نہیں ہے اسے بھی میں نے پہچانا خدا کے ہی نور سے۔ حضرت علیؑ ہر چیز میں اعتدال کے قائل تھے۔ اور ان کی نظر میں ہر اس شخص کو بہترین امت کہا جا سکتا تھا جو بیچ کا راستہ اختیار کرتے ہیں (النمتہ الاوسط) پیچھے چلنے والا رفتہ رفتہ اس تک پہنچ جاتا ہے اور کمتر انسان واپس لوٹ کر پھر اسی کے پاس آتا ہے۔ حضرت علیؑ کی اہمیت واضح ہوتی ہے حضرت محمدؐ کے الفاظ ہیں کہ 'میں آگاہ کرنے والا ہوں اور علیؑ رہنما و رہبر ہیں'۔ اور علیؑ میرے لئے اس طرح ہیں جیسے موسیٰؑ کے لئے ہارون تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میرے بعد کوئی پیغامبر نہ ہوگا۔

ہر صوفیانہ دائرہ میں حضرت علیؑ کو ملکہ حاصل تھا۔ علی بن عثمان الجویری صاف صاف کہتے ہیں کہ حضرت علیؑ کی شہرت اور ان کا درجہ صوفیانہ حلقوں میں بیحد عظیم تھا۔ اصول حق کو انہوں نے بڑی گہرائی سے سمجھا اور بڑی خوش اسلوبی سے سمجھایا تھا۔ وہ صوفیوں کے لئے ایک نمونہ تھے جو اندرونی و بیرونی دونوں حقائق اور سچائی کو سمجھتے تھے۔ علی نے علم کی تحصیل کے لئے حوصلہ دیا (سرمایۂ علم لدنی)

شیخ جنید بھی علی کو اپنا شیخ مانتے تھے اصول میں بھی اور شدت احساس میں بھی تحمل میں بھی اور سوچ میں بھی۔ اصول اور عمل میں قوت برداشت و صبر ضروری تھا۔

مفتاح الطالبین کا مصنف تو اس حد تک لکھتا ہے کہ اقطاب ثلثہ میں جو اعلیٰ ترین مقام (ولایۂ عظمیٰ) کے باہری حلقہ میں جو ولایۂ محمدی ہے وہاں تک علی کا مدخل تھا۔ یہ بھی لکھا گیا ہے کہ خواجہ محمد پارسا نے اس پر زور دیا تھا کہ خلیفہ اول حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ زمرۂ اہل مشاہدہ میں، خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ اہل مجاہدہ کے زمرہ میں اور خلیفۂ سوم حضرت عثمان اور (ا) متکیان امیرالمؤمنین حضرت علیؑ اہل معاینہ تھے جس کی صف یقیناً اولیں تھی کیونکہ ہجویری کہتا ہے کہ اہل سلوک میں مجاہد وہ ہیں جو اہل معاینہ کے عروج تک نہیں پہنچے۔ اہل معاینہ وہ ہیں جن کا عقیدہ و مذہب تکمیل کی حد تک پہونچ چکا ہو اور جنہیں بصیرت و بصارت دونوں حاصل ہو چکی ہوں اور جنہوں نے بغیر کسی پردہ کے خدا کی وحدت کی حقیقت کو سمجھ لیا ہو اور جو بے نقاب حقیقت منتظر کو سمجھ کر عشق کی تکمیل تک پہونچ چکے ہوں۔

حضرت علیؑ کے صوفیانہ انداز و آداب کے سلسلے سے وسط ایشیا کی تواریخ میں دو پہلو ملتے ہیں۔

ملفوظات کا جو ذخیرہ وہاں ہے اس میں بھی دو طرز بیان ہیں ۔ کچھ نے حضرت علیؓ کو نقشبندی سلسلہ کی اصل جان اور سرچشمہ کہا ہے مگر کچھ نے ان کا نام بھی نقشبندی صوفیوں کے شجرۂ روحانی میں شامل نہیں کیا۔ ملفوظات بہاء الدین نقشبند میں اس شجرہ کا سلسلہ کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

'حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام علم باطن میں دو طرف جڑے ہوئے تھے ایک طرف اپنے پدر گرامی امام محمد باقر سے جن کی روحانی راہ و روش امام زین العابدینؒ امام حسینؓ اور حضرت علیؓ سے ملتی تھیں پھر حضرت محمدؐ سے۔ دوسری طرف یہ روحانی بندھن ان کے نانا قاسم بن محمد بن ابوبکر صدیق سے جا ملتا ہے۔ خواجہ حسن نثاری بخاری (جوخود بھی ایک سولھویں صدی کے نقشبندی صوفی تھے اسی روحانی کڑی کی تائید کرتے ہیں کہ 'تصوف کی سرزمین میں ابوعلی فرمودی یعنی شیخ غزالی کے دوہرے انتساب تھے ایک حضرت شیخ جنید بغدادی سے تین قدموں اور ذریعوں سے اور دوسری طرف شیخ ابوالحسن خرقانی سے جن کا واسطہ ابو یزید بسطامی سے بھی تھا جو سلطان العارفین کہلاتے ہیں اور جن کا واسطہ حضرت امام باقر سے بھی تھا اور وہ حضرت زین العابدینؒ، امام حسینؓ، حضرت علیؓ اور حضرت محمدؐ تک پہونچتا تھا۔

دوسری طرح کی تواریخ و ملفوظات میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نقشبندیوں اور صوفیوں کا اولین صوفی بتایا گیا ہے جن کا روحانی سلسلہ حضرت محمد تک ملتا ہے اور ان کے چاروں اوتاد یعنی قوۃ انقلاب سے بھی۔ علی کو اس میں شامل کرنے سے احمد بن جلال الدین کاشانی نے بھی انکار کیا ہے۔ کاشانی کی کتاب رسالہ در بیان سلسلۂ نقشبندیہ میں صرف ابوبکر کا نام اس ضمن میں لیا جاتا ہے علی کا نہیں۔ شیخ احمد سرہندی نے بالکل دوسرا نیا خیال پیش کیا ہے جس میں امام جعفر صادق کو حضرت علیؓ اور حضرت ابوبکرؓ دونوں سے جڑے ہونے کی وجہ سے اہم کردار نبھاتے دکھایا ہے۔ چونکہ امام جعفر صادق کا شجرہ باپ کی طرف سے حضرت علیؓ اور ماں کی طرف سے حضرت ابوبکرؓ سے ملتا تھا کیونکہ ان کی ماں حضرت ابوبکرؓ کے پوتے قاسم بن محمد کی دختر نیک اختر تھیں اسی لئے امام نقی کے دور میں حضرت علیؓ و حضرت ابوبکرؓ کے صوفیانہ انداز ہم آہنگ ہو گئے۔ حضرت علیؓ کے صوفیانہ جذبوں میں علم کی بہتات پر زور تھا اور دونوں ہی پیغمبر کی محبت پر مبنی تھے ۔ موجودہ دور کے صوفی ادب میں بھی یہ طرز نمایاں ہے کہ کچھ تصوف کو اول و چوتھے خلیفہ سے منسوب کرتے ہیں یعنی ابوبکرؓ اور علیؓ سے اور یہ دونوں ہی

صوفیوں کے لحاظ سے بہت اہم و عظیم روحانی کردار ہیں۔ دوسرے کہتے ہیں کہ صرف ابو بکر رضی اللہ عنہ کو یہ سعادت حاصل ہے۔ ایک تیسرا حلقہ ان صوفیوں کا ہے جنھوں نے خود کو صرف ابو بکر یا علی سے نہیں جوڑا ہے بلکہ صرف حضرت محمد کے نام لیوا ہیں اور انہیں کے توسط سے دوسروں سے رابطہ رکھتے ہیں۔ حالانکہ جہر بھی نقشبندیوں میں عام تھا اور ذکر جہر اور ذکر خفی کا ذکر بھی ملتا ہے مگر کچھ اور اطلاعات بھی اس پر ہیں۔ شیعہ سلسلہ سلسلۃ الذہب یا گولڈن چین کا ذکر بار بار ان تاریخی کتابوں میں ملتا ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ماوراء النہر میں نقشبندیوں کی ایک شیعہ شاخ جو سنہری زنجیر کہلاتی تھی موجود تھی اور خاصی مقبول تھی۔ جامی نے اپنی 'سلسلۃ الذہب' کتاب میں، جو ۱۰۱۶ میں سمرقند میں لکھی گئی اس میں فرائضوں کو یعنی (درخدمت رفضنا) شیعوں کو نصاریٰ سے تشبیہ دیتے ہوئے یہ کہا ہے کہ وہ یسوع مسیح کو اپنا قبلہ مانتے ہیں اور علو کی وجہ سے علی کی اہمیت بڑھالیتے ہیں۔ جامی نے ایسے بھی صوفیوں کی تنقید کی ہے جو سر اور جہر کو اپنی ذاتی زندگی کی خوشیوں کا محور بنا کر خدا کے ذکر کو فراموش کر بیٹھتے ہیں۔ ایسے بھی اذکار میں بے ایمانی و مکاری شامل ہے۔ رسالہ کے خاتمہ پر امام شافعی کے کچھ کلام بھی دیے گئے ہیں۔ خواجہ باقی باللہ نے رسالۂ مبلغ الرجال میں جو کچھ لکھا ہے اس سے مختلف بیان دارالمعارف میں ملتا ہے۔ شیخ فریدالدین عطار اور مولانا رومی کی شاعری میں بھی علی کے لئے ایک دوسرا پیغام جو بڑا شیریں ہے ملتا ہے۔

نقشبندی سلسلہ میں حضرت علی کو اولین فنا کی حیثیت سے پیش کرنے میں حضرت علیؓ کے معتقدوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ ذیقعدہ ۸۹۲ کے درمیانی سالوں میں مفتاح الطالبین میں یہ واقعہ درج ہے کہ سمرقند کے ایک درویش نے جو ذاتی طور پر ہر طرح کی پاک و صاف شخصیت رکھتا تھا اور جس کے معتقدین اور ساتھیوں کی تعداد بہت تھی اس نے ایک دفعہ حضرت علیؓ کو سمرقند کے چہارراتیل میں دیکھا۔ وہ گھوڑے پر سوار تھے اور ان کے ہاتھ میں ایک نشان تھا۔ حضرت علیؓ نے یہ اعلان کیا کہ ابھی تک یہ ولایت خلیفہ سے منسوب تھی جو حضرت ابوبکر صدیق تھے۔ اب یہ عہدہ مجھے دیا جا رہا ہے اور اس کا مناسب اعلان ہونا چاہئے۔ مفتاح الطالبین میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابو سعید بن الخیر اپنی روحانی تلاش و تجربوں کو جو ابتدائی دنوں میں ہوئے تھے برابر اپنے پیر کو بتاتے رہتے تھے انہوں نے کہا کہ گو انہوں نے ماوراء النہر کے شیخوں اور خواجہ کی رہنمائی اور طریقت کے

انداز سمجھنے کی کوشش کی ہے مگر وہ ان سے متاثر نہیں ہوا کیونکہ نہ ان کی معرفت نہ ہی ان کی مشکلات طریقت و طریق اس پر واضح ہوئی۔ مایوس ہوکر جب وہ خوارزم گیا اور وہیں کی خانقاہوں مسجدوں و مقبروں میں بشارت کی امید میں اور حوالات کی غیبی خواہش میں تڑپ رہا تھا اسی وقت ایک رات جب وہ سجدہ میں تھا اس نے ایک آواز سنی جو اسے بلا رہی تھی جب وہ مقررہ جگہ پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ وہاں کوئی نماز پڑھ رہا ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ امیرالمومنین حضرت علیؓ ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا خواجہ ان کا مرید ہونا چاہیں گے۔ بیعت کے بعد کچھ تجربے بھی ہوئے۔

حالات دشمنان ابوسعید ابی الخیر میں بھی ابوسعید کا سلسلہ مکمل حضرت علیؓ اور حضرت محمدؐ سے وابستہ بتایا جاتا ہے۔ خوارزم میں شیخ نجم الدین کبریٰ و ان کے مریدوں کا سلسلہ بھی اسی طرح حضرت علیؓ سے ملتا ہے اور کمیل بن زیاد سے شروع ہوکر شیخ اسمٰعیل مقری پر ختم ہوتا ہے۔ نجم الدین کبریٰ کی حضرت علیؓ پر لکھی ہوئی نظمیں و منقبت بڑی فصیح و بلیغ اور بے حد موثر ہیں جن سے علم ہوتا ہے کہ عقیدتمندی اپنے عروج پر تھی۔ گوکہ نجم الدین کبریٰ کی منقبت اور ان کے عقائد دونوں ہی سے ان کے شیعہ رجحان رکھنے کا کہیں بھی شائبہ نہیں ملتا مگر وسط ایشیا میں کبراویہ سلسلہ کو اکثر و بیشتر شیعہ طور وطرز سے وابستہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ مَیل کا یہ قول کہ شیخ نجم الدین کبریٰ کوئی سنی، شیعہ مذہب چلانا چاہتے تھے رضوی کے خیال میں صحیح نہیں ہے کیونکہ ان کے مطابق کم و بیش سبھی صوفی اسی قسم کے جذبات و خیالات رکھتے تھے۔ مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کبراویہ سلسلہ کی کئی کڑیوں اور لائنوں میں شیعہ میلان دیکھا جاسکتا ہے شائد یہ حضرت علیؓ کی شخصیت کا اثر تھا۔ یہ بھی سچ ہے کہ کبراویہ سلسلہ سے ہی ایک سلسلۃ الذہب ابھرا جو مکمل طور پر شیعہ تھا جو اناطولیہ کے بابائی سلسلہ کی طرح کافی حد تک علیؓ سے وابستہ تھے اور انہیں خدا کا سایہ ہی سمجھتے تھے اسی بابائی سلسلہ سے جانثاریوں کا بیکتا شیعہ آرڈر بھی ابھرا۔ اسی لئے تیمور نے غزاوات کا اعلان ترک حسینی سنی حنفی مذہب ریاست کے خلاف کردیا۔

خراسان میں شیخ حیدر کا شیعہ سلسلہ اور شاہ نعمت اللہ ولی سمرقندی کا تعریف نعمت اللہیہ سلسلہ عام لوگوں میں بہت مقبول تھا۔ شیخ نعمت اللہ کو تیموری حاکم شاہ رخ کی سرپرستی حاصل تھی بعد میں احمد شاہ اول بہمنی شاہ دکن کی بھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب خواجہ محمد ناصر نے (۱۷۵۹-۱۲۹۴) ایک نیا

مجددیہ نقشبندیہ سلسلہ ''طریقۂ محمدیہ'' شروع کیا تو ان کے فرزند میر درد نے اس سلسلہ کو مقبول و معرف بنایا، چونکہ وہ خود شیعہ تھا تو حضرت علیؑ کی عقیدت کچھ زیادہ گہری تھی اور انہیں کے زیر اثر۔

حضرت علیؑ کا تعلق حسن بصری سے کس انداز کا تھا اس پر بھی اختلاف رائے ہے۔ کچھ نے تو حضرت علیؑ و حسن بصری کو ایک ہی سمجھا ہے دوسروں نے حسن بصری کو حضرت علیؑ کا شاگرد بتایا ہے۔ اطہر عباس رضوی کا خیال ہے کہ حسن بصری نے حضرت علیؑ سے ہی ذکر سیکھا مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان کا باہمی رابطہ طویل رہا ہوگو کہ دونوں نے ہی فتوتی سلسلہ کے آداب کافی حد تک اپنائے اور برقرار رکھے۔ مارٹن لنگ کی رائے اس بابت زیادہ واضح ہے کہ حسن بصری بہت ابتدائی زندگی سے حضرت علیؑ سے استفادہ و رہنمائی حاصل کر رہے تھے۔ حسن بصری سے ہی زیادہ تر صوفی سلسلے نکلے ہیں۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ ابومحمد جعفر خلدی حسن بصری کے سلسلے سے کہیں بھی حضرت علیؑ کا نام نہیں لیتے، مگر کچھ ایرانی اور بغدادی مخطوطات میں حسن بصری کا گہرا تعلق حضرت علیؑ سے دلالت کرتا ہے۔ حضرت علیؑ کی مقبولیت صحیح معنوں میں اغی سلسلوں میں تھی جو کئی صدیوں تک غرباء میں مقبول تھا اور اس کا ذکر ابن بطوطہ کی تحریر میں ملتا ہے۔ علی کے طرز کو ہجویری نے فقر وصفا اور حب اللہ کا ایک نفیس مجموعہ کہا ہے۔ یہ پوچھنے پر کہ سب سے عزیز و صاف شئے کیا ہونی چاہئے۔ جواب ملا کہ **غنا القلب بالله** کیونکہ جو دل خدا کی محبت سے معمور ہو وہ دنیاوی نعمتوں سے محروم رہ کر بھی امیر رہتا ہے۔

علیؑ بھی سالک کے لئے لقمہ حرام سے پرہیز ضروری سمجھتے تھے۔ نقشبندیوں کی طرح وہ خدمت الملوک، نصف السلوک کے قائل نہ تھے۔ جلال الدین رومی نے علی کی ساری تعلیمات کی تفصیلات دی ہیں۔ علی اس کے قائل تھے کہ جس نے خود کو سمجھا اس نے خدا کو پالیا۔ حضرت علیؑ کی نفس کشی کی ہر جگہ تعریف کی گئی ہے۔ شرح جنید بغدادی میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ ایک سید بغداد حج کے لئے گیا اور جنید سے ملنے پہنچا اس نے کہا کہ وہ علی کی نسل کا ہے اور گیلان سے تعلق رکھتا ہے۔ جنید نے کہا ''علی نے اپنی تیغ دوبار چلائی ایک کافروں پر اور دوسری نفس پر''۔

نہج البلاغہ میں اپنے خطبے ۲۰۸ میں علیؑ نے اپنے خیالات کا اظہار اور تفصیل سے کیا ہے۔ ان کی رحمدلی کے ثبوت فوجی افسروں اور ٹیکس کلکٹروں کو لکھے گئے ان کے خطوط میں موجود ہیں۔

حضرت علیؑ کا دیوان فصاحت و بلاغت کا مجموعہ ہے ان کی مختلف النوع شخصیت کی تعریف جامی

نے میر علی شیر نوائی کو لکھے گئے اپنے خطوط میں کی ہے۔ سلطان حسن بایقرا کے دربار میں جب حضرت علیؑ کے ذریعہ لکھی گئی قرآن کی کاپی لائی گئی تو لوگ ان کی فنِ خطاطی پر حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ حضرت علیؑ معما کے شائق اور مشاق و ماہر تھے۔ ان سبھی کا ذکر تفصیل سے وسط ایشیا کے مآخذ میں ملے گا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؑ کا الہام غیبی بھی غیر معمولی تھا اور منگولوں کے حملے کی پیش گوئی ایک مثال ہے۔ حکیم بن تورا نے کہا ہے کہ ان کی عوام سے محبت غیر معمولی تھی۔ شریعت سے انحراف کبھی نہیں کیا۔ ان کی مہر پر نقش خاتم الملک للہ الواحد القھار اور نعم القادر الا اللہ ثابت کرتا ہے کہ ان کی طرزِ حکومت کی بنیاد کیا تھی۔